باب ششم

جنگ کے میدان میں

معرکہ پانڈو کے سترہ سال بعد، جہاں سیکنڈ لیفٹیننٹ اختر نے دس ہزار فٹ اونچی چوٹی پر پاکستان کا پرچم لہرایا تھا، ایک بار پھر جنگ کا میدان گرم ہوا۔ اب وہ لاہور برکی کے محاذ پر تھے، دسویں ڈویژن کی 24 فیلڈ رجمنٹ میں سیکنڈ ان کمانڈ میجر اختر عبدالرحمٰن۔ اس نے اپنی زندگی کے یہ سترہ قیمتی سال کس طرح گزارے تھے؟

ستمبر 1949ء میں اسے کیپٹن کے طور پر ترقی ملی اور کچھ عرصہ نوشہرہ کے آرٹلری سکول میں انسٹرکٹر کے فرائض انجام دیے۔ یہاں طالب علم نے استاد کی طرح سوچنا اور برتنا سیکھا، جو اگلے سالوں میں اس کی شخصیت اور مزاج کا حصہ ہو گیا۔ ستمبر 1951ء میں وہ لانگ گنری کورس برطانیہ کے لیے منتخب کیا گیا، اور اپریل 1952ء میں وہ پھر نوشہرہ لوٹ آیا۔ جولائی 1953ء میں میجر کے طور پر ترقی دے کر اسے ایک رجمنٹ کے ہمراہ ملتان بھیج دیا گیا۔ یہاں فوراً ہی کوئٹہ سٹاف کالج سے سٹاف اینڈ کمانڈ کورس کے لیے بلاوا آ گیا، جس میں دوسروں کے علاوہ کیپٹن ضیاالحق بھی شریک تھے۔ اپریل 1954ء میں جب اس کی تقرری بیٹری کمانڈر کے طور پر چٹاگانگ میں ہو چکی تھی، اسے میجر بنا دیا گیا۔ اکتوبر 1954 سے اپریل 1956ء تک یہ بیٹری ڈھاکہ میں متعین رہی۔ اپریل 1956ء سے فروری 1957ء تک جی ایچ کیو راولپنڈی میں فرائض انجام دیے اور فروری 1957ء سے دسمبر 1957ء تک سٹاف کالج کوئٹہ میں۔ دسمبر 1957 میں آرٹلری بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں اسے بریگیڈ میجر بنا دیا گیا، جہاں اس نے اگلے پندرہ ماہ تک خدمات انجام دیں۔ فروری 1959ء سے اپریل 1960ء تک ایک بار نوشہرہ میں بیٹری کمانڈر کے طور پر، اپریل 1960ء سے دسمبر 1960ء تک کیمبل پور میں رجمنٹ کے سیکنڈ ان کمانڈ کے طور پر۔ دسمبر 1960ء سے اپریل 1961ء تک یہ رجمنٹ مانسر کیمپ میں متعین رہی۔

اپریل 1961ء میں میجر کو پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول میں صلاح الدین ایوبی کمپنی کا کمپنی کمانڈر بنا دیا گیا۔ یہ ایک اعتبار سے اس کی زندگی کے نئے عہد کا آغاز تھا، جہاں منفرد سپاہی کے جوہر دوسروں پر کھلے اور خود اپنے آپ پر بھی۔ کمیشنڈ افسروں کے لیے قائم کیے گئے افواج پاکستان کے تربیتی ادارے میں، جنہیں آنے والے کل میں قیادت کے فرائض انجام دینا ہوتے ہیں، ہمیشہ بہترین لوگوں کا انتخاب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اکیڈیمی کے استاد سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ ان ذہین اور پرعزم نوجوانوں کے لیے ایک مثالی فوجی افسر اور رہنما کے کردار کا نمونہ بنے۔ اسے ایک باکردار، باہمت اور صاحب شعور آدمی دکھائی دینا چاہیے، جس کی خواب تراشنے والے نوجوان تقلید کر سکیں۔ ادارے کے ایک سابق سربراہ نے کہا، میں کبھی اس کمپنی کمانڈر کا وجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا، جو اپنے طالب علموں میں نامقبول ہو جائے، ایک راہنما نامقبول کیسے ہو سکتا ہے۔'' ایک سابق جرنیل کی رائے میں فوج کے تربیتی ادارے میں کمپنی کمانڈر کا کردار روحانی باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح ایک بچہ اپنے کردار کی تشکیل میں سب سے زیادہ اپنے والد کا اثر قبول کرتا ہے، اسی طرح ایک کیڈٹ اپنے اس استاد اور رہنما سے سیکھتا ہے۔ ان اساتذہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ ان نوجوانوں پر

انفرادی طور پر توجہ دیں، جن میں سے بہت سے پہلی بار اپنے گھروں سے الگ ہوئے ہوتے اور روزمرہ کی آرام دہ زندگی کے مقابلے میں پہلی بار سخت کوشی کا ذائقہ چکھتے ہیں۔

انہیں حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا درس دیا جاتا ہے، انہیں سکھایا جاتا ہے کہ مردان کار بے وفائی کرنے اور غلط بیانی کرنے والے نہیں ہوتے۔ اس سارے عمل میں کیڈٹ تو ایک امتحان سے گزرتے ہی ہیں، خود ان کا استاد بھی ایک آزمایش سے دوچار رہتا ہے۔ میجر اختر عبدالرحمٰن اس امتحان میں کس حد تک پورے اترے۔ پہلے سے زیادہ سختی کے ساتھ انہوں نے خود کو ایک سانچے میں ڈال لیا اور ذمے داری کا احساس اپنے آپ پر سوار کر لیا۔ تین سال تک ان کی صلاح الدین ایوبی کمپنی دوسری تمام کمپنیوں سے بڑھ کر کارکردگی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ میجر کو ہر میدان میں اول رہنے کا خبط تھا، چنانچہ ہر سال جب فوجی افسروں کے گھریلو باغیچوں کی مقابلہ رہتا تو بھی اس کے گھر کا چمن اول انعام حاصل کرتا۔

کاکول اکیڈیمی کے کمانڈنٹ کرنل (بعد میں جنرل) عبدالحمید بھوپالی کو، جن کے ساتھ بعد ازاں سپاہی نے لاہور چھاونی میں خدمات انجام دیں، اور عمر بھر جاری رہنے والے تعلق کی بنیاد رکھی، 33 سالہ کمپنی کمانڈر کے تیور خوب یاد ہیں۔ فروری 1974ء میں لاہور کی اسلامی سربراہی کانفرنس کے انتظامات کی نگرانی کرنے اور بعد ازاں وزیراعظم بھٹو اور صدر جنرل ضیاالحق کی طرف سے متعدد مناصب کی پیش کش مسترد کرنے والا جرنیل، جو انیسویں صدر کے انگریز ججوں کی یاد دلاتا ہے، اپنے ماتحت کو شاندار لیکن جچے تلے الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتا ہے، ''ہمیشہ وقت کی پابندی کرنے والا، کم گو، الفاظ کے استعمال میں حد درجہ محتاط، نہ خوشامد کرنے والا اور نہ نظم کی خلاف ورزی کا مرتکب ہونے والا، وہ آدمی جو کبھی خوف کا شکار ہو کر دبتا تھا اور نہ کبھی ناترا شیدہ نظر آتا تھا، سچ بولنے والا، کردار میں پاکیزہ، غیر ضروری مشاغل سے بے زار، وقت کی قدر کرنے والا، بے حد محنتی اور منظّم، نئے خیالات کو قبول کرنے والا لیکن متوازن اور عملی، مکروہات سے اجتناب کرنے والا TEATOTLER WITH A CAPITAL " T

کیا جرنیل کو اپنے شاگردوں پر فخر تھا؟ اور وہ ایک استاد کے طور پر اپنے کردار سے اتنا ہی مطمئن تھا، جتنا کہ دوسرے؟ کوئی ایسا راوی نہیں ہے، جو اس باب میں اس کے محسوسات کو تفصیل سے بیان کر سکے، لیکن یہ تو ریکارڈ کی بات ہے کہ بعد میں اس کے شاگردوں کا معیار ہمیشہ دوسروں سے بہتر رہا۔ اس کی شہادت کے ڈیڑھ سال بعد 1990ء میں میجر جنرل کا جلیل منصب سنبھالنے والوں میں سے اکثریت اس کے شاگردوں کی تھی۔

مئی 1965ء میں جب دسویں ڈویژن کے دستے برکی کی سرحد پر متعین کیے گئے تو میجر کا خیمہ بی آر بی نہر سے ادھر بنگالی گاوں میں تھا، جہاں اب تک حصار سے پاکستان آ بسنے والے سخت جان میو آباد ہیں۔ سب لوگ جانتے تھے کہ میجر کا جی اپنے خیمے اور دفتر میں نہیں لگتا۔ وہ ایک جنون کے ساتھ توپوں کے لیے موزوں مقامات کا انتخاب کرنے کے لیے کھیتوں میں گھومتا دکھائی دیتا۔ وہ ایک ایک باغ، ٹیلے، جھنڈ اور نہر کے دونوں اطراف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پھیلے ہوئے گرد آلود دیہات کا جائزہ لیتا۔ اگلے چار ماہ میں وہ اس علاقے سے اتنا شناسا ہو چکا تھا کہ جب وہ عشروں سے ان دیہات میں آباد کسانوں سے گفتگو کرتا تو وہ حیرت زدہ رہ جاتے۔ وہ ایک اعلیٰ افسر نہیں تھا اور جنگ میں اسے محدود ذمے داریاں انجام دینا تھیں، لیکن وہ اس طرح متحرک دکھائی دیتا گویا ذمے داری کا سارا بوجھ اسی پر ہے۔ وہ اپنے توپچیوں کو بتاتا کہ جنگ وہ جیتتا ہے، جو دوسروں سے زیادہ مستعد، چست اور اہل ہو۔ اس کے افسر اور جوان دیکھتے تھے کہ جب وہ جنگ، مقابلے اور سرحد پار والوں کی بات کرتا ہے تو اس کا لہجہ مچان پر بیٹھے شکاری کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بھارتی اور ہندوستانی نہیں، کافر اور ہندو کہتا تھا۔ 1947ء کے فسادات اور ہجرت کا سفر اس کے دل میں بالکل گزرے ہوئے کل کی طرح تازہ دکھائی دیتا تھا۔

اس کے لیے جنگ کوئی ایسی چیز نہیں تھی، جو اچانک آ پڑنے والے ایک امتحان کی طرح نمودار ہوتی ہے، اس کے لیے تو یہ ایک مستقل دشمنی اور

مستقل معرکہ آرائی تھی۔ وہ مقابلہ جو ہزار برس سے جاری تھا اور معلوم نہیں کب تک جاری رہتا ہے۔ جب کبھی وہ گفتگو پر آمادہ ہوتا اور اپنے جوانوں میں احساس کی آگ کو اور زیادہ روشن کرنا چاہتا تو اس موضوع پر اختصار لیکن روانی اور کسی قدر جوش کے ساتھ گفتگو کرتا۔ وہ اپنی رجمنٹ کی توپوں اور جوانوں کو ادھر ادھر حرکت دیتا رہتا، جیسے مستقل طور پر ان کا امتحان لے رہا ہو۔ وہ ہمیشہ اس سوال پر بحث کرتا رہتا کہ کسی کام کو زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ کم از کم وقت میں انجام دینے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

اس کے قریبی لوگ جانتے تھے کہ وہ خود کتنا سخت جان اور کس قدر مرتب آدمی ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ صحت کے معاملے میں بے پناہ حساس واقع ہوا ہے اور ایک ہمیشہ قائم رہنے والی ضد کے ساتھ ایسے کسی بھی مشغلے اور مصروفیت سے گریز کرتا تھا، جس سے اس کی تندرستی متاثر ہو۔ اور یہ تو سب کو معلوم تھا کہ وہ جنگی مہارت کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے لیے وہی لوگ پسندیدہ تھے، جو اپنے ہنر کو بہتر بنانے اور ہمیشہ سیکھنے میں لگے رہتے تھے۔ غیر متوجہ اور کاہل لوگوں کے لیے اس کے دل میں کوئی عزت نہیں تھی۔ وہ بادہ نوشوں پر کھلاڑیوں کو اور خیالات میں کھوئے رہنے والوں پر مستعد اور بیدار لوگوں کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کی شہرت ایک ایسے آدمی کی ہوگئی تھی، جو زیادہ سے زیادہ معقول اور متعلق چیزوں سے واسطہ رکھنا چاہتا ہے۔ جو کام کے دوران دباؤ کا شکار نہیں ہوتا اور خود کو دوسروں سے زیادہ کامیاب دیکھنا چاہتا ہے اور اس طرح اپنی بیڑی اور کمپنی کو بھی۔ کام میں کوتاہی کرنے والوں پر وہ بعض اوقات برہم ہو جاتا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ زندگی ایک چیلنج ہے، جس کا سامنا مستعدی، محنت، اخلاص اور نظم ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ سب جانتے تھے کہ وہ بھارت سے نفرت کرتا ہے اور اتنی شدت سے اس کا قرض چکانے کا آرزومند ہے گویا یہ اس کی ذاتی عزت کا مسئلہ ہو۔ اسے بعض لوگ اس کی کمزوری بھی قرار دیتے تھے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ آدمی کو کسی بھی ایسے کام سے گریز کرنا چاہیے، جو سے اس کی عزت پر حرف آئے۔ جب اس سے سوال کیا جائے تو وہ کہتا تھا کہ زندگی کی راحت معرکہ آرائی اور ان کامیابیوں میں ہے، جو مسلسل محنت سے حاصل کی جاتی ہیں۔ وہ مطالعہ کا شوقین دکھائی نہ دیتا تھا اور نہ ہی فکری بحثوں کا، لیکن اس کے قریبی لوگ جانتے تھے کہ ہنگامی حالات میں اپنے معمولات جاری رکھنے والے آدمی کے کمرے میں عسکری تاریخ کی ایک کتاب دکھائی دیتی ہے، جس کے چند اوراق کا وہ روزانہ مطالعہ کرتا اور کبھی کبھار اس پر تبادلہ خیال کرتا ہے۔ اس کے لیے زندگی چند اصولوں کی سختی سے پاسداری، عزم اور وفا کا نام تھا اور یہ زندگی کھلے میدانوں، جنگ کے محاذ اور ان کھیتوں میں تھی جہاں وہ بدترین مصروفیت میں بھی انتہائی باقاعدگی کے ساتھ سیر کرنے جاتا۔

وہ مذہبی موضوعات پر زیادہ بات نہیں کرتا تھا، لیکن کبھی کبھار جب آوارگی، بادہ نوشی یا فریب دہی کا کوئی واقعہ اس کے علم میں لایا جاتا یا اسے فیصلہ کرنے کو کہا جاتا تو اس کے چہرے پر تکدر کے آثار ابھرتے، اپنے ٹھیرے ہوئے مضبوط لہجے میں وہ کہتا، ''آدمی کو خدا سے ڈرنا چاہیے''۔ وہ لوگوں کی مذمت کرنے میں جلدی سے کام نہیں لیتا تھا اور جب کسی پر بہتان لگایا جاتا تو وہ دوسروں کی طرح غیبت کی بدمزہ جگالی کی بجائے ثبوت طلب کرتا۔ لوگ دیکھتے کہ جمعہ کی دوپہر کو وہ کرتا شلوار پہنتا اور اہتمام سے جمعہ ادا کرنے جاتا، لیکن کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ باقی کی نمازیں بھی ادا کرتا ہے یا نہیں۔

کشمیر میں آپریشن جبرالٹر کے بعد جو ذہنی طور پر مفلس اور مہم پیشہ لوگوں کی مرتب کی گئی مہم تھی، ملک کی سرحدوں پر جنگ کی حرارت محسوس کی جا رہی تھی۔ اگرچہ مسٹر بھٹو کی وزارت خارجہ کو یقین تھا کہ بھارت بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کرے گا، لیکن کم قامت شاستری سبق سکھانے اور اپنی پسند کا محاذ کھولنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ 8 ستمبر کو جنگ کی پہلی گولی چلی تو میجر اختر عبدالرحمٰن بنگالی گاؤں کے خیمے سے دو میل جنوب میں لدھن کی رجمنٹل کمانڈ پوسٹ میں چلے گئے، جو امرودوں کے ایک مختصر باغ میں قائم کی گئی تھی۔ جس جنگ کے لیے میجر پچھلے چار پانچ ماہ سے اس قدر مستعد تھا، اس نے ایک کمزور وقت میں اسے آلیا۔ اسے تین روز پہلے پیچس کی تکلیف ہوگئی تھی، محاذ جنگ پر موزوں دوائیاں دستیاب تھیں، نہ پھل۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا،

بھاگ دوڑ میں کمی کردی اور وہ دہی سے اپنا علاج کررہا تھا۔اپنی علالت نے اسے تھوڑا سا پریشان تو کیا،لیکن وہ اس پہلو سے پوری طرح مطمئن تھا کہ وہ ماتحت بیڑیوں کی نقل وحرکت اور توپوں کی پوزیشنوں کے بارے میں پہلے ہی مکمل جزئیات کے ساتھ پوری تیاری کر چکا تھا۔

6 ستمبر کی صبح جب برکی سے آگے، برکہ کلاں کے پاس سے، جہاں ہڈیارہ سیم نالہ اب بھی پہلی سے بیزار خاموشی کے ساتھ بہتا ہے، میجر شفقت بلوچ نے وائرلیس پر بھارتی ٹینکوں کے حرکت میں آنے اور حملے کے آغاز کی خبر دی، تو میجر اپنی بیماری بھول کر چوکس ہوگیا اور اس کے قریبی لوگوں کے سوا کسی کو اندازہ تک نہ ہوسکا کہ وہ تکلیف میں ہے۔اس وقت وہ ایک دفاعی منصوبے پر کام کررہا تھا، جس کے تحت جنگ شروع ہوتے ہی اگلے مورچوں پر متعین توپچیوں کو برق رفتاری کے ساتھ بی آر بی نہر کے اس طرف منتقل کیا جانا تھا، جب میجر شفقت بلوچ اپنے جوانوں کو لے کر پیچھے ہٹ رہا تھا، میجر اختر نے بھی برکہ کلاں میں متعین اپنی بیڑی کو پہلے سے طے شدہ اس منصوبے کے تحت نہر پار کرنے کا حکم دیا۔

مشکل یہ آن پڑی کہ توپ کھینچنے والی ایک لاری TOWER آخری وقت پر خراب ہوگئی۔کیپٹن قاضی نے میجر کو مسئلے سے آگاہ کیا تو اس نے دوٹوک انداز میں کہا کہ ہر حال میں تمام توپوں کی واپسی ضروری ہے۔ چنانچہ بھاگ دوڑ کرتے لوگ پہلی پانچ توپوں کو واپس لے جانے والی لاریوں میں سے ایک کو واپس لائے۔اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ برکی کا پل بہت دور دکھائی دیتا تھا اور اسے اڑانے کے لیے فلیتے کو آگ لگائی جا چکی تھی۔ جب برکہ کلاں سے آخری 105 ہوٹزر توپ اس پر سے گزری تو چند لمحے بعد پل ایک دھماکے سے اڑا اور اس کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کیپٹن قاضی نے وائرلیس پر اطلاع دی کہ وہ توپ واپس لے آیا ہے۔

میجر کو یقین تھا کہ دوسری رجمنٹوں کے مقابلے میں اس کے آدمی زیادہ سرعت کے ساتھ حرکت کر سکتے ہیں۔لہٰذا پیچھے ہٹنے اور پھر ضرورت کے مطابق گولہ باری کرنے کے عمل میں اسے گھبراہٹ کا سامنا نہیں تھا۔''پوزیشن نمبر 9 پر چلے جاو۔'' وہ قطعی اور صاف انداز میں کہتا اور تفصیل بیان نہ کرتا۔اسے یقین تھا کہ اس کے لوگ ان جزئیات پر صحت کے ساتھ عمل کریں گے، جو وہ انہیں بار بار ازبر کرا چکا تھا، اور یہ کہ دشمن وائرلیس پر اس کی بات سن پائے تو اس کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔اس کے توپچی گولوں پر چاک سے اللہ اکبر لکھتے اور آگ برساتے رہے۔وہ ان سے بے خطا نشانے کی توقع رکھتا تھا اور وہ خود کو اس کی نگراں آنکھوں کے سایے تلے محسوس کرتے تھے، جیسے وہ ان میں سے ہر ایک کا اعمالنامہ مرتب کررہا ہو۔

7 ستمبر کی صبح کو اچانک آرٹلری بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں طلب کرلیا گیا۔اسکا بریگیڈئر میجر اچانک بیمار ہوگیا تھا، اور اب اسے ڈویژنل ہیڈکوارٹر میں فرائض انجام دینا تھے۔اپنے تین ہم منصبوں میں سے بہترین افسر کے طور پر اس کی شہرت اور گزشتہ روز کی غیر معمولی کارکردگی تھی، جو اسے یہاں لے آئی تھی۔کسی کو معلوم نہ تھا کہ اپنے بریگیڈئر میجر کی طرح وہ خود بھی بیماری کا شکار ہے اور اس وقت جب لاہور ابھی خطرے میں تھا، اس نے خود بھی کسی کو یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

جیسے ہی وہ آرٹلری کے بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں داخل ہوا، جو پیچھے لاہور چھاونی کی حدود میں واقع تھا، اسے اطلاع ملی کہ بھارتی ٹینک برکہ کلاں کے قریب پہنچ چکے ہیں۔آبزرور کا کہنا تھا کہ وہ ہڈیارہ سیم نالہ، بی آر بی سائفن کے نیچے سے گزر کر لاہور کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔اگر ایسا تھا تو یہ ایک بڑی خطرناک صورت حال تھی۔میجر حیرت کے ساتھ بڑبڑایا کہ بھارتی اتنے طباع اور بہادر کب سے ہوگئے۔اس وقت میجر کا ہیڈکوارٹر ماسٹر بھی قریبی علاقے میں موجود تھا۔میجر نے اس سے وائرلیس پر رابطہ کر کے صورت حال معلوم کرنے کا حکم دیا اور بے تابی کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔کپتان اپنی بے نشان جیپ میں سائفن کے نیچے سے گزر کر قریب جا پہنچا، یہاں کوئی ٹینک نہ تھا لیکن اسلحہ اور گولہ بارود سے بھری گاڑیاں ضرور موجود تھیں۔اس نے میجر کو ان کی پوزیشنوں سے آگاہ کیا اور فائر کرنے کو کہا۔ان بھارتی ٹرکوں کے قریب سے گزرتے ہوئے جن پر پاکستانیوں سے ملتے جلتے رنگ کی

وردیوں والے بھارتی فوجی سوار تھے، کپتان کچھ دیر میں واپس چلا آیا۔

8 ستمبر کی رات آ گئی اور اگرچہ دشمن کی پیش قدمی رکی ہوئی تھی، لیکن اس کا دباؤ ختم نہ ہوا تھا۔ لاہور چھاؤنی سے سیالکوٹ کی طرف بھیجے جانے والی کچھ توپیں، ہوائی حملے کے اندیشے سے ادھر ادھر پھیلا دی گئی تھیں، میجر کوان کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے آرٹلری کمانڈر بریگیڈئر جمیل اختر عزیز سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ سیالکوٹ روانہ کرنے سے پہلے یہ توپیں برکی پر دشمن کا دباؤ کم کرنے کے لیے استعمال کی جائیں، چنانچہ ڈویژنل کمانڈر میجر جنرل سرفراز کے مشورے سے جنہوں نے بعد میں سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا کہ انہوں نے لاہور کے خوب صورت چہرے پر ایک خراش تک نہیں آنے دی، ایسا ہی کیا گیا۔

جنگ کے میدان میں اور بہت سے نازک مرحلے بھی آئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ توپوں کے گولوں کی فراہمی کے عمل میں گاڑیوں کی کمی کا مسئلہ درپیش ہو گیا۔ 24 فیلڈ رجمنٹ کا اسلحہ ڈپو ہوائی اڈے کے قریب واقع تھا۔ جنگ جاری تھی، اور شہر سے ٹرک تلاش کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا، چنانچہ ہوائی اڈے کے ساؤنڈ سسٹم سے اعلان کرایا گیا کہ محاذ جنگ پر گولے لے جانے کے لیے گاڑیوں کی ضرورت ہے۔ کچھ ہی دیر میں اعلان کردہ مقام پر چمکدار مرسیڈیز سمیت ہر طرح کی گاڑیوں کی ایک لمبی قطار دکھائی دینے لگی۔ جنگی تاریخ میں شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ کاروں میں گولہ بارود ڈھویا گیا ہو، اس قوم اور اس سپاہ کو جو اس انداز میں جنگ کا سامنا کرتی تھی، کون شکست دے سکتا تھا۔

بھارتیوں نے دوسرا حملہ واہگہ کے محاذ پر کیا تھا، جو لاہور کی فتح کے بارے میں اس قدر پر یقین تھے کہ ان کے ایما پر بی بی سی نے پہلے ہی فتح کی خبر جاری کر دی تھی۔ 24 فیلڈ رجمنٹ کی طرح یہاں 21 فیلڈ رجمنٹ کے توپچیوں نے انفنٹری کے ان بہادروں کے ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ کیا، جن کے کارنامے تاریخ کا حصہ ہیں۔

9 ستمبر کی رات حملے کا زور ٹوٹ گیا اور دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ اب بھارت کا مذاق اڑا رہے تھے، جو اپنے سے تعداد میں کم فوج کا سامنا نہ کر سکا، جو ایک طرف تو اس قدر پر امید تھا کہ اس نے لاہور کے لیے اشوکی کمار نام سے ایک شخص کو پہلے سے سول ایڈمنسٹریٹر مقرر کر رکھا تھا اور اس کے افسر کے جم خانہ کلب میں جام لنڈھانے کے منصوبے بنا رہے تھے اور دوسری طرف یہ عالم تھا کہ وہ ایک پوری کور کے حملے سے بی آر بی نہر عبور نہ کر سکے۔

آرٹلری کمانڈ پوسٹ سے میجر کا گھر صرف چار سو گز کے فاصلے پر تھا، جہاں اس کی بیوی اور کم عمر بچے جنگ کی بے یقینی کا شکار تھے۔ اولین دنوں میں ایک آدھ بار اس نے ٹیلی فون پر ان کی خیریت معلوم کی، لیکن پھر اس کے خاندان والوں کو پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ شاید وہ اپنے کام میں اس قدر مگن تھا کہ اس نے رابطہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی، یا شاید اسے اس احساس نے آ لیا تھا کہ اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے کے لیے اسے ہر چیز سے رابطہ منقطع کر لینا چاہیے۔ گھر میں اس کی بیوی، اپنے سرتاج کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہوئے نفلی روزوں کی منتیں مان رہی تھی۔ ایک ماہ، دو ماہ، چار ماہ، چھ ماہ اور وہ وائرلیس سیٹ پر جھکا ہدایت دینے میں محو تھا۔ اب اس پر ایک سے زیادہ رجمنٹوں کی ذمے داری تھی اور وہ ہمیشہ سے زیادہ انہماک اور احساس ذمے داری کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ دشمن کی تعداد تین گنا سے زیادہ تھی اور پیچھے لاہور شہر لاکھوں مکینوں کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔

اس وقت 84 گھنٹے گزر چکے تھے، جب جنگ میں قرار کا لمحہ آیا۔ لاہور پر قبضے کی خبر دینے والی بی بی سی وضاحتیں جاری کر رہی تھی، اور غیر ملکی اخبار نویسوں نے بے عیب استری والی وردیوں میں ملبوس افسروں کو مسکراتے اور جوانوں کو اللہ اکبر کے نعرے لگاتے دیکھا۔ 9 ستمبر کی رات وہ پہلی بار چند گھنٹے کے لیے آرام کی نیند سویا۔ اسے سب سے زیادہ اس بات پر اطمینان تھا کہ اس کے توپچی اس کی تربیت کردہ معیار پر پورے اترے تھے۔ انہوں نے پچاس ساٹھ گولوں کی بجائے جو ایک عام اوسط ہے، گھنٹے بھر میں ایک سو بیس گولے برسائے تھے، حتیٰ کہ گوپوں کے دہانے سرخ ہو گئے

تھے۔اس نے سچ کر دکھایا تھا کہ نشانہ توپ نہیں، توپچی لگاتا ہے۔لاہور کے محاذ پر پھیلی ہوئی سپاہ نے شجاعت کی تاریخ میں ایک باب کا اضافہ کیا تھا، اور اس میں میجر کے ساتھی دوسروں سے بہتر رہے تھے۔لاہور شاداں وفرحان تھا، اور جوش وجذبہ سے ابلتا ہوا، وقت سے پہلے ہی اپنی فتح کا جشن منا رہا تھا ۔چند روز میں جنگ بند ہوگئی، لیکن دوسروں کے لیے، میجر اختر عبدالرحمٰن کے لیے نہیں، اسے دوسرے محاذ سے بلاوا آ گیا اور اس وقت لوگ کہہ رہے تھے کہ لاہور کا اللہ، آرٹلری اور ائرفورس نے بچالیا۔

چند روز میں ستمبر 1965ء کی جنگ بند ہوگئی، لیکن دوسروں کے لیے، میجر اختر عبدالرحمٰن کے لیے نہیں، اسے دوسرے محاذ سے بلاوا آ گیا۔پاکستانی فوج نے دشمن کے سب سے زیادہ علاقے پر قبضہ کیا تھا، صحرا کی خاموشی بار بار ٹوٹتی رہی۔ستمبر کے آخری ہفتے اور اکتوبر کے اوائل میں مسلسل خبریں آتی رہیں کہ بھارتی دستے چھینا ہوا علاقہ واپس لینے کی سرتوڑ کوششیں کر رہے ہیں۔شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ مذاکرات کی میز پر جنگی قیدیوں کے تبادلے اور علاقوں کی واپسی کا مرحلہ آئے تو بہتر پوزیشن میں ہوں اور اپنی پسند کی شرائط منوا سکیں۔

اب جی ایچ کیو میں سوال یہ تھا کہ کیا راجستھان میں کچھ اور فوج بھجوائی جاسکتی ہے، جہاں دو پاکستانی ڈویژن دو کور بھارتی فوج کے مدمقابل ہیں۔ واضح طور پر اس سوال کا جواب نفی میں تھا کہ اگرچہ جنگ بندی ہو چکی تھی، لیکن دونوں طرف کے فوجی اب بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بیٹھے ہوئے تھے اور گاہے بہ گاہے جھڑپیں اب بھی ہوتی تھیں اور خطرات ٹلے نہیں تھے۔

اکتوبر کے آخر میں بریگیڈ میجر کے فرائض انجام دینے والے اختر عبدالرحمٰن اب لیفٹیننٹ کرنل ہو گئے تھے، ایک روز اچانک حکم ہوا کہ وہ توپخانے کے عسکری مرکز نوشہرہ چھاؤنی روانہ ہو جائیں، جہاں ان کو ایک نئی رجمنٹ تشکیل دینی تھی۔انہیں تیاری کے لیے تھوڑا سا وقت ہی دیا گیا، لیکن انہیں درحقیقت کوئی تیاری کرنا ہی نہ تھی۔میجر نے اپنے گھر کا چکر لگایا، بیوی بچوں کو نئی ذمے داری سے آگاہ کیا، سامان سمیٹا اور لاہور ریلوے سٹیشن سے پہلی گاڑی پکڑی اور نوشہرہ روانہ ہو گیا۔

اگلے دو روز میں سارے میجر، کپتان، لیفٹیننٹ اور جوان نوشہرہ چھاؤنی پہنچ چکے تھے۔انہوں نے ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھ کر ایک گورے چٹے افسر کو دیکھا، جو کمال مستعدی لیکن اعتماد کے ساتھ کام کر رہا تھا، گویا ہفتوں سے اسی پر مامور ہو۔یہ فوج کے عام ماحول کے برعکس تھا، ساز وسامان، کروفر اور نہ شان وشوکت۔ایک میز، چند کرسیاں اور تھوڑے سے کاغذ۔

اس نے زیادہ صلاح مشورہ نہیں کیا۔نواردوں کی فہرستیں بنائیں، افسروں سے مختصر سی گفتگو کر کے ان کے پس منظر اور مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی، جوانوں کو ان کے سپرد کیا اور تیزی سے ذمے داریوں کی تقسیم کرنے لگا۔''ہمیں جلد میدان جنگ میں پہنچنا اور جنگ میں شریک ہونا ہے۔''اس نے اپنے افسروں اور جوانوں کو بتایا۔چار دن میں نئی رجمنٹ تشکیل پا چکی تھی۔

سات سو سے زیادہ جوان اور افسر گاڑیوں میں سوار ہوئے اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔انہیں نوشہرہ سے حیدرآباد اور پھر راجستھان کے صحرا میں پہنچنا تھا، جہاں راتیں سرد تھیں اور دنوں میں درجہ حرارت اب بھی 120 تک جا پہنچتا تھا۔ہنگامی طور پر تشکیل پانے والی یہ رجمنٹ کئی اعتبار سے مختلف تھی۔اس میں داڑھیوں اور عینکوں والے وہ بڈھے شامل تھے، جنہیں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزارتے کئی سال گزر چکے تھے۔ان میں وہ غیر فوجی ڈرائیور بھی تھے، جو چرس پیتے تھے اور دوسری طرف وہ لوگ تھے، جو فراغت کی زندگی میں زیادہ سختی کیساتھ عبادات کی پابندی کرنے لگے تھے۔

لیفٹیننٹ کرنل نے بڑی پھرتی کے ساتھ آبزرویشن، کمیونی کیشن، ایڈمنسٹریشن اور گنرز کی ٹیمیں تشکیل دیں، لیکن وہ آدمی جس نے ساری سپاہیانہ زندگی میں افسروں اور جوانوں کی ٹریننگ پر سب سے زیادہ زور دیا تھا، اس خیال سے مضطرب تھا کہ یہ ڈھیلی ڈھالی یونٹ موزوں کارکردگی کا مظاہرہ

کیسے کرے گی۔ وہ دوسروں سے بڑھ کر جانتا تھا کہ اگر رجمنٹ ایک ٹیم کی طرح بروئے کار نہیں آسکتی تو اس سے کسی نتیجے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔

چنانچہ اس نے ریل کے سفر کے دوران تربیت کا عمل جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ گاڑی کی کھلی بوگیوں میں توپیں نصب تھیں، جب اس کی طرف سے دی جانی والی ہدایات کی روشنی میں افسروں نے جنگی درس کا سلسلہ جاری رکھا تاکہ لوگ باہم گھل مل جائیں، وہ تیزی سے بروئے کار آسکیں، ایک دوسرے کو خوب سمجھ لیں، اور جب وہ جنگ کے میدان میں اتریں تو تماشائیوں کی طرح الٹی سیدھی حرکتیں نہ کرنے لگیں۔ 48 گھنٹے کے بعد جب ریل گاڑی حیدرآباد کے ریلوے سٹیشن پر پہنچی تو وہ کتنا سیکھ چکے تھے، یہ اصل سوال نہیں تھا، بات تو بس اتنی تھی کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا جائے اور بہترین طور پر جو تدبیر کی جاسکتی ہے، اس میں کمی نہ کی جائے۔

انہوں نے حیدرآباد سے آگے چوہر ریلوے اسٹیشن تک اسی گاڑی میں سفر کیا، لیکن اب یہ گاڑی انہیں موناباو رسے آگے واسر باہ ریلوے اسٹیشن تک نہیں لے جاسکتی تھی، جہاں ریل کی پٹڑی یکا یک مختصر ہو جاتی ہے۔ یہاں کمانڈنگ افسر نے سامان اتارنے کے عمل کی نگرانی کی اور اپنی رجمنٹ کو بتایا کہ اب انہیں زمینی راستے سے سفر کرنا ہے۔ اس نوتشکیل شدہ رجمنٹ کے ایک کپتان کو زمینی قافلے کی ذمے داری سونپی اور خود چھوٹی لائن پر چلنے والی مخصوص ریل گاڑی میں سوار ہو کر واسر باہ روانہ ہو گیا۔ سڑک سے جانے والا قافلہ جو دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر چلا تھا، ڈوبتے سورج کی شفق میں چوہر نامی ریلوے اسٹیشن کے قریب رکا تاکہ شام کا کھانا کھالیا جائے، دھول میں اٹی گاڑیوں کا جائزہ لیا جائے، صحرا کے سفر کے لیے چھاگلیں بھر لی جائیں اور جوان صبح کاذب تک آرام کے چند گھنٹے گزار لیں۔

خیمے گاڑے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک بنگالی افسر کا نوائے کے نگران کیپٹن ترمذی کی تلاش میں نکلا۔ اس نے کپتان کو بتایا کہ ''شی او'' (سی او) وائرلیس پر ان سے بات کرنا چاہتا ہے۔ ''شی او صاحب واسر باہ پہنچ چکے تھے اور بے تابی سے اپنی یونٹ کے منتظر تھے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ جوان آرام کرنے کے لیے رک گئے ہیں اور صبح سویرے ازسرنو سفر کا آغاز کریں گے، تو کمانڈنگ افسر نے کپتان کو بیچ ہی میں ٹوکتے ہوئے حکم دیا کہ وہ کھانا کھانے کے بعد خیمے اکھاڑیں اور سفر پر روانہ ہو جائیں۔ وہ جنگ میں شرکت کے لیے بے چین تھا۔

کپتان نے لیفٹیننٹ کرنل کو بتایا کہ خراب ہو جانے والی ایک گاڑی کو وہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں، کئی ٹرکوں کے پہیے پنکچر ہو چکے ہیں اور چرس پینے والے غیر فوجی ڈرائیور بری طرح تھک چکے ہیں، لیکن اس کا حکم اٹل تھا۔ اکتوبر کے آخری دنوں میں دم بہ دم سرد ہوتے ہوئے صحرا کی تازہ ہوا میں رات کا یہ سفر اس کپتان کو آج بھی اچھی طرح یاد ہے، جس نے بعد ازاں بریگیڈیئر کے منصب پر ترقی پائی۔

''دشمن کی فضائیہ کے حملے سے بچنے کے لیے ہم نے گاڑیوں کی روشنیاں بجھا رکھی تھیں اور صحرا کی ریت پر ستاروں کی روشنی میں سفر کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ تین دن سے محو سفر ڈرائیوروں کی ہڈیاں درد سے چیخ رہی تھیں، لیکن ہمیں ہر حال میں سفر جاری رکھنا تھا۔''

صبح کے چار بجے جب صبح کاذب کی مدہم اور پراسرار روشنی پھوٹ رہی تھی، وہ واسر باہ ریلوے اسٹیشن کے عقب میں پہنچے تو انہوں نے کرنل کو منتظر پایا۔ صحرا کی نرم ہوا وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے، انتظار میں کھڑا تھا۔

اس نے انہیں تھوڑی دیر ستا کر ناشتہ کرنے کو کہا اور بتایا کہ وہ مختلف بیڑیوں کے لیے ان مقامات کا تعین کر چکا ہے، جہاں سے انہیں صحرا کی جنگ میں شریک ہونا ہے۔ اس وقت بارہ چودہ میل کے فاصلے پر واقع جنگ کا میدان جاگ رہا تھا۔

رجمنٹ کے افسروں کو، جنہوں نے پہلے ہی دن ایک کامران معرکے میں شرکت کی اور اگلے کئی ہفتے بلند مورال کے ساتھ صحرا میں گزارے، اپنے کمانڈنگ افسر کا پہلا حکم آج تک یاد ہے، ''میری یونٹ کا کوئی آدمی شراب نہیں پیے گا۔'' اس وقت جب بادہ نوشی برٹش آرمی کی جانشین فوج کے

معمولات میں سے ایک تھی، یہ قدرے حیران کر دینے والا ایک حکم تھا، لیکن کسی ابہام کے بغیر جاری کیا گیا، لہذا شراب کی بوتلیں یونٹ کے سامان سے الگ کر دی گئیں۔

نئی یونٹ کو جنگ کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اسی رات دشمن نے پاکستانی دستوں پر حملہ کر دیا، جو تعداد میں ایک چوتھائی سے بھی کم تھے۔ کرنل نے جو معرکے کے لیے ذہنی طور پر یوں تیار دکھائی دیا، جیسے وہ ہفتوں سے اسی ادھیڑ بن میں ہو، اپنے توپچیوں سے کہا کہ وہ بے قراری کا مظاہرہ نہ کریں اور دشمن کو آگے آنے دیں۔ جب وہ قریب آ چکے اور پوری طرح ان کی گولیوں کی زد میں آ گئے تو ایک شکاری کی طرح جو اپنے شکار کو ڈھونڈتا پھرا ہو، اس نے ان پر گولے برسانے کا حکم دیا۔ جال میں آئی ہوئی مچھلی کی طرح اب وہ مچھیروں کے ہاتھ میں تھے۔ کچھ ہی دیر میں سیکڑوں لاشیں آخر شب کی ٹھنڈی ریت پر تڑپ رہی تھیں۔ چند گھنٹوں میں ایک معرکہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ پاکستانی فوج کو ایک بھی سپاہی ہلاک تو کیا ، زخمی تک نہ ہوا تھا۔ یہ تھا ایک کمانڈر، معرکوں میں جینے اور فتح میں آسودگی حاصل کرنے والا ایک آدمی، جس کی ساری عمر کمال ہنر کی تلاش میں بیت گئی، اور جو اپنی آدھی سے زیادہ جنگ، جنگ شروع ہونے سے پہلے کی تیاریوں اور تدبر میں لڑتا تھا۔ بھارتی خوف زدہ ہو کر بھاگے اور اپنے مرنے والوں کی لاشیں اٹھانے کے لیے نہیں آئے۔ جب رجمنٹ کے جوانوں اور افسروں نے کرنل سے اس بارے میں بات کرنا چاہی کہ صحرا میں سڑتی لاشوں کا کیا کیا جائے تو اس نے بے نیازی اور کسی قدر سرد مہری سے کہا، ''تمہیں اس کی کیا فکر ہے، وہ خود ہی اگلی رات کی تاریکی میں انہیں اٹھا لے جائیں گے۔''

پاکستانی فوج کے مقدر میں اب کچھ زیادہ معرکے نہیں تھے۔ اپنی محدود تعداد کے ساتھ، وہ پہلے ہی بہت سے علاقے پر قبضہ کر چکے تھے، اور اگلے دنوں میں انہوں نے کچھ اور علاقہ ہتھیا لیا۔ بھارتیوں کا مورال ٹوٹ چکا تھا اور وہ ہوا میں زرد پتوں کی اڑتے چلے جا رہے تھے۔ بعد میں اس جنگ میں شریک ایک کپتان نے کہا، ''ہم ان سے کہتے تھے جانم، ذرا ٹھیرو تو سہی، چہرہ تو کراو، لیکن وہ تو بھاگتے ہی چلے جاتے تھے۔'' اب پاکستانی دستوں کو مزید آگے نہیں بڑھنا تھا، کیونکہ زیادہ وسیع علاقے میں اگلے دستوں کے ساتھ موثر رابطہ (لائن آف کمیونی کیشن) ممکن نہ تھا۔ چنانچہ جنگ کی حالت باقی رہی ، لیکن اب خال خال ہی کوئی جھڑپ ہوتی۔ پاکستانیوں کے لے اب یہ لڑائی سے زیادہ تفریح تھی، کبھی کبھار تو وہ کسی کتے کے دم کے ساتھ ٹین باندھ کر اسے بھارتیوں کی طرف بھگاتے اور فائرنگ کا تماشا دیکھتے۔ صحرا کی بیزار کن خاموشی ان لوگوں کو الجھن میں مبتلا کر رہی تھی، جو دشمن کو فنا کرنے یا خود قتل ہونے کے لیے آئے تھے۔ ان میں سے جو اگلے مورچوں میں تھے، وہ زیادہ بیزار تھے۔ سارا دن آنکھوں سے دوربین لگائے رکھنا یا تاخیر سے موصول ہونے والے اخبار کی ایک ایک سطر پڑھ ڈالنا ایسے مشاغل نہیں تھے، جو بے چین لوگوں کی ساری توجہ جذب کر لیتے۔ چنانچہ آبزرویشن کے بوریت کا شکار ایک کپتان کو اس وقت قدرے مسرت کا احساس ہوا، جب اسے بتایا گیا کہ اسے کمانڈنگ افسر کے ایجوٹنٹ کی جگہ کام کرنا ہے، جو چند روز کی رخصت پر چلا گیا ہے۔

کمانڈر نے جو دوسروں کی طرح بیزاری اور بوریت کا شکار نہ تھا، اور ہمیشہ کوئی مصروفیت ڈھونڈ نکالتا تھا، کپتان کو ایک تجزیہ لکھنے کا حکم دیا کہ جب وہ اپنا کام ختم کر چکے تو اسے نیند سے بیدار کر کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے۔ آدھی رات کو اس نے جھجکتے ہوئے کرنل کے خیمے پر دستک دی۔ پہلی آواز پر وہ اٹھ بیٹھا، اس نے سپرنگ سے حرکت کرنے والا پلنگ کا سرہانہ اٹھایا، لالٹین کی بتی بلند کی اور سرخ پنسل ہاتھ میں لے کر مسودہ پڑھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اس پر درجنوں سرخ نشان لگا چکا تھا۔

ہمیشہ بہترین کا مطالبہ کرنے والے آدمی کے ساتھ کام کرنا آسان نہیں تھا اور کبھی کبھار تو اس میں بڑے تلخ لمحے آتے۔ ایک روز کپتان نے کمانڈر کے حکم پر ایک عبارت لکھی، اور اس کے خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے چند پیراگراف پڑھے اور پھر مخصوص وضع کا فوجی پیڈ بیزاری کے ساتھ ہوا میں

اچھال دیا، ''یہ کیا ہے؟'' اس نے سختی اور ناراضی کے ساتھ اس سے کہا۔ اس نے ایڑیاں جما کر سیلیوٹ کیا اور کاغذ اٹھائے بغیر باہر نکل آیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ استعفے کے ساتھ ایک بار پھر کمانڈر کے سامنے پیش ہوا اور اس کے استفسار پر اس نے جواب دیا،

SIR , I CAN NOT SERVE UNDER YOU .

توانا اور چست کرنل یہ جملہ سن کر اپنی کرسی سے اٹھا تو کپتان خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا، لیکن کرنل نے اس جا لیا۔ پھر اس نے کافی کی دو پیالیاں طلب کیں، اسے اپنے سامنے بٹھایا اور بتایا کہ آخر کار وہ ایک آدمی ہی تو ہے، جس پر بعض اوقات تلخی غالب آ جاتی ہے۔ احساس توہین کا شکار کپتان کافی پیتا ہوا رو پڑا تو کرنل نے اٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

کپتان کو یاد ہے کہ جب کچھ دنوں بعد کمانڈر کا بشیر نامی ایجوٹنٹ لوٹ آیا، جسے اس کے فربہی مائل جسم کی وجہ سے بشیر موٹا کہا جاتا تھا، تو ہمیشہ مصروف رہنے والے آدمی سے نجات کی نوید میں، وہ سکول کے بچے کی طرح خوشی سے اچھلا، اس نے اپنا بستر باندھ کر ٹرک پر پھینکا اور خود اس پر سوار ہونے ہی والا تھا، جب اسے عقب سے کرنل کی آواز سنائی دی،

CAPTAIN , WHERE ARE YOU GOING ?

کپتان، تم کہاں جا رہے ہو؟

اس نے بتایا کہ کرنل کا ایجوٹنٹ چھٹی سے واپس آ گیا ہے

''تو کیا؟'' اس نے کہا۔

YOU ARE MY AD JOTENT AS LONG AS YOUR TWO LEGS CARRY YOU.

یہ ایک رفاقت کا آغاز تھا، جو آنے والے سالوں میں پھلتی اور پھولتی رہی۔ کپتان نے پاکستان آرمی میں بریگیڈئر کا عہدہ پایا اور وہ ملک کے موثر ترین ادارے آئی ایس آئی میں ایک اہم منصب پر پہنچا، حتیٰ کہ ریٹائرمنٹ کا دن آ پہنچا، لیکن یہ رفاقت کا اختتام نہیں تھا۔

اس روز وہ آدمی ملک سے باہر تھا، جواب قلم و قرطاس سے جی لگانے کی کوشش کر رہا ہے، جب اس نے ہوٹل کے کمرے میں ٹیلی وژن پر 17 اگست کے سانحہ کی خبر سنی۔ سیکورٹی کے نازک اسرار و رموز سے آشنا افسر بے ساختہ رو پڑا اور اس نے سوال کیا کہ ملک کا صدر، فوج کا سربراہ، اور جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا سربراہ ایک ہی جہاز میں کیسے سوار ہو گئے؟ وہ آدمی جس نے برسوں ہر شام سیر پر نکلنے والے آدمی کی نگہداشت کی تھی، جو گھر اور راستے کے درمیان کار کے روٹ کا تعین کرنے کے لیے اپنے باس کی ناراضگی مول لے سکتا تھا، سوچتا اور حیران ہوتا رہا۔ اب بھی وہ سوال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وہ اس روز ڈیوٹی پر ہوتا تو جنرل کو کبھی اس سی 130 میں سوار نہ ہونے دیتا، اور وہ بادگر سوال کرتا ہے کہ آخر یہ ہوا کیسے؟ کس نے اس کا اہتمام کیا، کس نے اس کی اجازت دی، اس کا منصوبہ کس نے بنایا ؟

1965ء کے چھ سال بعد سپاہی ایک بار پھر جنگ کے میدان میں تھا، جواب بریگیڈئر بن چکا تھا۔ قصور شہر سے ادھر حسینی والا کی کھاڑی میں اس نے دوسروں کے ساتھ ایک معرکے میں شرکت کی، جو ملک کی عسکری تاریخ میں سنہری حروف سے رقم ہے، اور دمکتے لہجوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ فتح حاصل کر چکے تھے تو وہ ایک جنگی مورچے میں روتے ہوئے دیکھا گیا۔

یہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے فوجی جانشین جنرل یحیٰ خان کا پاکستان تھا، جس میں انتخابات ہو چکے تھے، اور فوجی صدر کی خواہشات اور اندازوں کے برعکس مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ نے نصف سے زیادہ نشستیں حاصل کر کے حکومت بنانے کا حق جیت لیا تھا۔ یحیٰ خان جس سے سورج غروب

ہونے کے بعد رابطہ کرنا مشکل ہوتا، عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ مغربی پاکستان کا سیاسی فاتح ذوالفقار علی بھٹو اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے ڈھاکہ جانے والے ارکان کی ٹانگیں توڑنے کی دھمکی کے بعد ''ادھر ہم، ادھر تم'' کا نعرہ لگا چکا تھا۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اقتدار چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا اور بھٹو اسمبلی کی مخالف بنچوں پر بیٹھنے کو تیار نہ تھا۔ انہوں نے عوامی لیگ کے خلاف ایکا کر لیا۔ نہ صرف پاکستان بلکہ بنگالیوں کی تاریخ میں پہلی بار تھا کہ انہیں حقیقی طور پر اقتدار حاصل ہونے والا تھا کہ سازشیوں نے ان کی راہ میں دیوار اٹھا دی۔ بھارت نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ہندووں، روس نواز بائیں بازو والوں اور انتہا پسندوں کی مدد سے انہوں نے نہ صرف عوامی لیگ کو فوج کے خلاف صف آرا کر دیا، بلکہ مارچ 1971ء میں جب قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کے بعد ناراض بنگالی میدان میں نکلے اور فوج نے ان کے خلاف کارروائی کر کے حکومت کے معطل اور لرزتے ہوئے اقتدار کو بحال کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے فوجی کارروائی سے خوف زدہ اور ناراض ہو کر سرحد پار کرنے والوں میں سے تخریب کار چنے، مکتی باہنی کے نام سے ان کی تنظیم قائم کی اور انہیں پاکستانی فوج کے خلاف میدان میں اتار دیا۔

مقامی آبادی کی ناراضگی اور شیخ مجیب الرحمٰن کی گرفتاری کے باوجود شاید تخریب کاری سے فوج کو شکست دینے کی کوشش ناکام رہتی کہ دوسری طرف ملک کو ہر حال میں متحد رکھنے کے آرزومند نوجوان البدر اور الشمس کے نام سے میدان میں نکل آئے تھے، اور محبِّ وطن قوتیں مشکل حالات میں بھی فوج سے تعاون پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ مشرقی کمان کے کمانڈر ٹکا خان نے بے شعور سفاکی کے ساتھ ظلم و ستم کا ایک باب رقم کیا اور اب نعرہ باز جنرل نیازی ان کے جانشین تھے۔ اس صورت حال میں جبکہ دس لاکھ سے زیادہ مہاجر بھارت جا چکے تھے، امریکہ اور مغربی یورپ، چین اور ایران سمیت ساری دنیا پاکستان سے سیاسی تصفیے کا مطالبہ کر رہی تھی، فوج کو اپنے ملک کا دفاع کرنا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھارتی فضائیہ نے مشرقی پاکستان میں موجود بیشتر پاکستانی طیاروں کو تباہ کر دیا، ہوائی اڈوں کو ادھیڑ ڈالا اور قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگی۔ ایک کور پر مشتمل پیدل دستوں نے، جس کے جوان برسات زدہ موسم میں مہینوں سے مورچوں میں پڑے تھے، کمال شجاعت سے دشمن کا سامنا کیا۔ ان کی تعداد اور ساز و سامان محدود تھا، انہیں مقامی آبادی کی حمایت حاصل نہ تھی، ایک ہزار میل دور سے ان تک کمک پہنچنا آسان نہ تھا، اور ان کی قیادت آوارگی اور ذہنی افلاس کا شکار تھی۔

ہمیشہ یہ بتایا گیا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی سرحدوں سے کیا جائے گا، لیکن اب مغربی سرحدوں پر پھیلے ہوئے دستوں کو کسی معجزے کا انتظار کرنے والے فوجی حکمرانوں نے کسی اقدام سے روک رکھا تھا، تا آنکہ دسمبر کا پہلا ہفتہ شروع ہو گیا، اور مشرقی پاکستان میں مشکل حالات میں فوج سے تعاون والی سیاسی قوتوں کے دباو کی وجہ سے اس کی اجازت دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

حسینی والا سیکٹر میں بریگیڈیئر اختر عبدالرحمٰن دوسروں کی طرح معرکے کے منتظر تھے۔ اگرچہ یہ ایک بڑی ہی تکلیف دہ صورتحال تھی، فوجی دستوں میں بنگالیوں کی موجودگی، جن کے اجداد کبھی ایک الگ وطن کا مطالبہ کرنے والی مسلم لیگ کا سب سے سرگرم حصہ تھے، اب شکوک و شبہات پیدا کرنے والا ایک عنصر بن گئی تھی۔ فوج کی مرکزی قیادت احتیاط کے تقاضوں کی بنا پر انہیں فوجی راز داری میں شریک نہ کرنے کا حکم صادر کر چکی تھی۔ حسینی والا سیکٹر میں خدمات انجام دینے والے ایک فوجی افسر کے بقول یہ اس طرح تھا، جیسے مقابلے کے میدان میں اترنے سے پہلے ایک باکسر کو بتایا جائے کہ وہ کینسر کا شکار ہو گیا ہے۔ جی ایچ کیو نے ہدایت جاری کی تھی کہ ڈیفنس پلان کے تحت، جو جنگ کی صورت حال میں نک سک سے درست، مکمل طور پر تیار رکھا جاتا ہے، نیچے ہدایات جاری نہ کی جائیں اور اس سلسلے میں انتہائی راز داری سے کام لیا جائے۔

بریگیڈیر اختر بار بار اپنی ڈویژن کے سربراہ مجید ملک کے ساتھ اگلے مورچوں کے دورے پر گئے تھے۔ وہ ایک ایک یونٹ اور ایک ایک مورچے میں جاتے رہے۔ 1965ء کی طرح انہوں نے گزشتہ ہفتوں میں اپر باری دوآب او سے بی آر بی اور بی آر بی سے سرحد تک، ایک ایک کونہ چھان مارا

تھا۔ایک جارح تکنیکی جرنیل کی قربت میں ، جو خود بھی آگے بڑھ کر لڑنے کا آرزومند تھا، انہوں نے دشمن سے نمٹنے کا ایک جارحانہ منصوبہ بنایا تھا۔انہوں نے اپنی توپیں اگلے سرحدی دیہات تک پھیلا دی تھیں، جس پر بعض افسر حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ حملے کی صورت میں ہم اپنی توپیں دشمن کے حوالے کرنے کی حماقت کے مرتکب نہیں ہوں گے، لیکن جنرل مجید ملک اور بریگیڈیئر اختر دشمن کو حملے کا موقع دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

حملے کا وقت آیا تو صورت حال یہ تھی کہ صرف اڑھائی گھنٹے میں توپچیوں کو ٹاسک ٹیبل (توپوں کے استعمال کی تفصیلات) سے آگاہ کرنا تھا۔عام حالات میں یہ توپخانے کے آپریٹر ہوتے ہیں، جو وائرلیس کی مدد سے، پہلے سے مرتب کیے ہوئے خاکے کے مطابق، توپچیوں کو تکنیکی زبان میں تفصیلی ہدایات جاری کرتے ہیں، لیکن اب اس کا وقت نہ تھا۔ چیتے کی طرح چوکنا بریگیڈیئر خود وائرلیس سیٹ پر آبیٹھا اور اس نے تین میجروں کی مدد سے سرعت کے ساتھ یہ کام مکمل کیا۔

3 دسمبر کی شام سوا چھ بجے شروع ہونے والی یہ جنگ، سرحد کے دونوں طرف بنائے گئے میلوں پر پھیلے ہوئے، آٹھ سے دس فٹ اونچے مٹی کے بندوں، قدرتی رکاوٹوں، جان پر کھیل کر فتح حاصل کرنے کے آرزومند پیدل دستوں اور توپچیوں کی جنگ تھی۔ برصغیر کی عسکری تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا ہوگا کہ حملے کا آغاز دن کی روشنی میں توپوں کی بے پناہ گولہ باری سے ہوا ہو۔ پندرہ منٹ تک 13 آرٹلری یونٹوں کی توپیں دھاڑتی رہیں، حتیٰ کہ پیدل دستے حرکت میں آ گئے۔ سرحد کے اس پار دریائے ستلج بہہ رہا تھا، اور اس سے نکلنے والی نہروں نے قدرتی رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں،، جو 300 سے 600 فٹ تک چوڑی تھیں، اور جن میں 15 فٹ تک گہرا پانی تھا۔ سرحد کے دونوں طرف قدآدم ہاتھی گھاس تھی، ان میں گڑھے کھود دیے گئے تھے، اور بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ سرحد کے اس پار دشمن کے دومنزلہ مورچے تھے، جن سے ٹکرانے والے گولے بعض اوقات معمولی نقصان ہی پہنچا سکتے۔

لیکن پھر 3 پنجاب، 9 پنجاب، 19 پنجاب، 15 پنجاب اور 41 بلوچ کی بیڑیاں حرکت میں آئیں، تو ایسا لگا کہ جیسے کسی نے مدتوں سے پنجروں میں بند بھوکے شیروں کو اذن عمل دے دیا ہے۔ ''مغربی سرحد کا دفاع'' کے بھارتی مصنف کے بقول، پاکستانی فوجی ان سرکنڈوں سے گزر کر جس میں پھٹنے والی سرنگوں نے آگ دہکا دی تھی، مورچہ مورچہ لڑتے ہوئے آگے بڑھتے گئے، تا آنکہ وہ سلیمانکی ہیڈ ورکس تک جا پہنچے، جس کی حفاظت کے لیے دشمن نے پختہ مورچوں اور دفاعی تنصیبات کا ایک جال بچھا رکھا تھا۔

3 پنجاب کی بی کمپنی کے عارف سعید سب سے پہلے شہید ہونے والوں میں سے ایک تھے، جو دشمن کے مورچے کے قریب پہنچ کر مشین گن کی زد میں آ گئے، لیکن شہادت سے قبل انہوں نے ایک دستی بم پھینک کر اس مورچے کو خاموش کر دیا۔ انہوں نے ساتھیوں کو چیخ کر آگے بڑھنے کے لیے کہا اور اپنے لہو میں نہا کر دم توڑ گئے۔ بی کمپنی کے کمانڈنگ افسر کرنل غلام حسین کو پیچھے ٹکر پوسٹ میں تھے، صورت حال کا ادراک ہوا تو وہ شہید کپتان کی سٹین گن اٹھا کر آگے بڑھے اور اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے دشمن کی طرف لپکے، انہوں نے کم از کم دو مورچے صاف کر ڈالے، جب خود بھی شہید ہو گئے۔

کمانڈنگ افسر کے وائرلیس آپریٹر لانس حوالدار شاہراہ خان نے زخمی ہونے کے باوجود اپنے فرائض کی انجام دہی جاری رکھی اور کسی کو خبر نہیں دی کہ کمانڈر شہادت پا چکا تھا، تا آنکہ زخموں سے بے پناہ خون بہہ جانے کی وجہ سے خود اس کا آخری وقت آ پہنچا۔

اب رات کی سیاہی غالب آ رہی تھی اور پہلے مرحلے میں تحیر کے شکار دشمن نے جوابی حملے کا آغاز کر دیا تھا، اس مرحلے پر آرٹلری سے فائر کرنے کا کہا گیا، دشمن کا ایک ٹینک سلیمانکی ہیڈ ورکس کا پل عبور کر کے آگے بڑھ آیا تھا، لیکن توپوں نے اس قدر گولے برسائے کہ اسے واپس جانا پڑا۔ رات تاریک تر ہوتی چلی گئی، اور مقابلے میں شدت آتی گئی۔ ایک بھارتی جرنیل کے بقول، پاکستانی فوجی پاگلوں کی طرح آگ، گولہ باری اور بارودی

سرنگوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے تا آنکہ وہ پل کے قریب جا پہنچے۔رات کے آخری پہر ایک دھماکے کی آواز سنائی دی، جیسا کہ اگلی صبح معلوم ہوا کہ پسپا ہوتے ہوئے دشمن نے پل کے پرلی طرف کے تین حصے اڑا دیے تھے۔اگلی صبح کچھ فاصلے پر واقع بھگت سنگھ کی سمادھی سے متصل قصر ہند کے مختصر سے قلعہ پر قبضہ کرلیا گیا، جہاں بھارتی پنجاب رجمنٹ کا ایک سیکشن آخری وقت تک مقابلے پر ڈٹا رہا، تا آنکہ ٹینک کے ایک فائر نے آخری سکھ سپاہی خاموش کر ڈالا۔اس مختصر سی جنگ میں، جس کے غازی کھلے آسمان تلے نیم پختہ مورچوں میں اس حال میں پڑے تھے کہ ان کے توپوں کے دہانے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ بریگیڈئر اختر کی کمان میں بروئے کار توپخانے کا کردار کیا تھا؟ راولپنڈی کے جی ایچ کیو میں فوجی ریکارڈ کے مطابق ''اس روز توپچیوں نے کمال کر دکھایا، 13 یونٹوں کی گولہ باری نے دشمن کو بے بس کر کے رکھ دیا۔انہوں نے اسے اتنا شدید نقصان پہنچایا کہ وہ سنبھل ہی نہ سکا۔ بہت سی توپوں کو ایک جگہ جمع کرنے کے بجائے انہیں دور تک ادھر ادھر پھیلا دیا گیا، یہ حکمت عملی پوری طرح کامیاب رہی۔ توپخانے نے دشمن کا مورال تباہ کر دیا اور پاکستانی فوجیوں کے مورال کو بلند کرنے میں مدد کی۔''

ایک مشکل لڑائی جیت لی گئی۔قصور شہر بچا لیا گیا اور لاہور پر اس رخ سے پڑنے والے دباو کا راستہ روک دیا گیا۔اگر جنرل مجید ملک اور بریگیڈئر اختر عبدالرحمٰن کی تجویز مان کر انہیں کمک مہیا کی جاتی اور آگے بڑھنے کی اجازت دے دی جاتی، تو وہ فیروز پور اور امرتسر کی طرف لپکتے، لیکن وہ احکامات کا انتظار کرتے رہے اور اس کی اجازت موصول نہ ہوسکی، تا آنکہ 17 دسمبر کا دن آ پہنچا۔

یہ شام کا وقت تھا، جب بریگیڈئر ایک پختہ مورچے میں بیٹھے اپنے ایک معتمد میجر کے پاس گئے اور اس بتایا کہ ابھی ابھی محاذ سے موصول ہونے والی اطلاع کے مطابق ڈھاکہ میں پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔یہ کہتے ہوئے 47 سالہ بریگیڈئر رو دیا۔بہت دیر تک وہ بے آواز آنسوؤں کے ساتھ روتا رہا، پھر اٹھا اور اس نے کہا، ''یہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے تھا۔'' لیکن یہ صرف دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا معاملہ نہیں تھا۔اس نے اس جنگ سے کئی سبق سیکھے۔جب وہ آئی ایس آئی کا سربراہ بنا اور جب اس نے افغانستان میں ایک جنگ کی قیادت کی تو اس نے یہ سبق یاد رکھے۔